صحافیوں کو مفت بروں سے بچایا جائے

تحریر: سہیل احمد لون

گزشتہ دنوں یونیوسٹی کی کلاس کے ساتھ برطانوی نشریاتی ادارے بی۔بی۔سی لندن اور سکائی نیوز جانے کا اتفاق ہوا۔دونوں مقامات پر ہمارے ساتھ گروپ لیڈر کے فرائض جناب سائمن والڈمین نے سرانجام دیئے۔سائمن والڈمین ہمیں براڈکاسٹ جرنلزم پڑھاتے اور سکھاتے ہیں۔ان کے ساتھ دونوں نشریاتی اداروں میں مطالعاتی دورہ کرنے کا سب سے بڑا یہ فائدہ تھا کہ وہ ہماری یونیورسٹی میں صرف پارٹ ٹائم پڑھاتے ہیں مگر وہ فل ٹائم جاب بی۔بی۔سی لندن میں ہی کرتے ہیں۔وہ گزشتہ پچیس برس سے بی بی سی میں کام کر رہے ہیں اور اس وقت وہ پروڈکشن دائیریکٹر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور صبح ساڑھے آٹھ سے ڈیڑھ بجے تک کی خبروں کی نشریات کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔انہوں نے نیوز روم،نیوز گیلری،ایڈیٹنگ روم،سمیت دیگر مقامات جہاں پر نیوز مختلف مراحل سے گزرتی ہے ہمیں دکھایا اور ساتھ سمجھایا۔اس کے علاوہ وہاں پر موجود celebrities کا براہ راست دیدار بھی ہوا۔بی۔بی۔سی بلاشبہ اپنے نام کی مناسبت سے ایک دیوہیکل آٹھ منزلہ عمارت پر محیط تھا جس میں ہزاروں کی تعداد میں صحافی اپنے قلمی،تصویری اور صوتی تقاضے پورے کرتے دکھائی دیے۔مگر سکائی نیوز اور سکائی سپورٹس کی عمارت کا سائز اس کے نام اور کام سے کافی چھوٹا نظر آیا۔سکائی میں کام کرنے والوں کی زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کافی تجربہ رکھتے ہیں۔جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں پر کافی کام کرنے والوں نے سائمن والڈمین کو دیکھ کر خوش آمدید کہا کیونکہ وہ سب پہلے بی بی سی میں سائمن والڈمین کے ساتھ کام کرتے تھے۔سکائی چینل کی ایک مشہور اینکر پرسن اور پریزینٹر Kay Burley سے ہماری ایک طویل نشست بھی ہوئی۔جس میں میرے ایک سوال کے جواب پر اس نے بتایا کہ جدید ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل میڈیا کی وجہ سے اب کام اتنا اعصاب شکن نہیں رہا جتنا 37 برس قبل تھا جب اس نے میڈیا جوائن کیا تھا۔Kay Burley نے بتایا کہ اس کا لب ولہجہ سکاٹش تھا اس وجہ سے اسے کوئی براڈکاسٹنگ میں جاب دینے کو تیار نہ ہوتا۔آج کسی کا لب ولہجہ اس کی جاب میں رکاوٹ نہیں بنتا۔اس نے اپنا کیریئر کا آغاز لوکل ریڈیو میں نیوز پڑھنے سے کیا اور اس کام کے لیے اسے معاوضہ نہیں ملتا تھا بلکہ اس نے بڑی کوشش سے Voluneer کام کرنے کی work-placement تلاش کی تھی۔بغیر معاوضہ لیے خبریں پڑھنے والی مادام کئے برلے آج سکائی چینل کی کامیاب پریزنٹر ہے۔وہ ہمیں صحافت کا طالب علم ہونے کے ناطے صحافتی میدان میں قدم رکھنے اور قدم جمانے کے گر بتا رہی تھی جس میں اس نے اپنی زندگی کے چند واقعات بھی ہم سے شیئر کیے۔

ایک وقت تھا جب وطن عزیز میں والدین اپنے ذہین بچے کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے تھے مگر اب وقت بدل گیا ہے حالات یہ ہو گئے ہیں کہ اب فلمی ہیروز اور ہیروئن کی جگہ بھی ٹی وی پریزنٹر اور اینکر پرسن نے لے لی ہے۔اب ترجیحات تبدیل ہوتی جا رہی ہیں صحافیوں کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا ہے کہ وہ بھی بیوروکریٹس کی طرح سدا بہار پاور پلے کا حصہ ہیں۔پہلے تو فنکاروں کو بیرون ممالک بلا کر ان کی پزیرائی اور ان کے فن سے محظوظ ہوا جاتا تھا مگر اب تو بیرون ملک میڈیا کانفرنس بھی منعقد ہونا شروع ہو گئی ہیں۔گزشتہ برس وطن عزیز گیا

لاہور میں جس رفتار سے پلوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ مگر پبلک ٹرانسپورٹ میں کمی نظر آئی، اتنی پبلک ٹرانسپورٹ نظر نہیں آتی جتنی تعداد میں DCNG Van سڑکوں پر نظر آتی رہیں۔ وطن عزیز میں اس وقت ٹی وی چینلز کی تعداد سو کے قریب ہے جس میں 45 ایکٹو نیوز چینلز ہیں۔ اخباروں میں لکھنے والے سے قارئین کی تعداد تجاوز کر چکی ہے۔ میڈیا وائیرس کی طرح سے سبک رفتاری سے پھیل رہا ہے۔ شیکسپئر کے دیس میں بھی اب دیسی میڈیا خوب پھل پھول اور پھیل رہا ہے۔ اس وقت برطانیہ میں پاکستانی صحافیوں کی تین مختلف تنظیمیں ہیں اور صحافیوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ پاکستانی ہائی کمیشن یا کسی جگہ کوئی احتجاجی مظاہرہ ہو تو مظاہرین کی تعداد سے زیادہ صحافی برادری کی تعداد یہ ظاہر کرتی ہے کہ ''میڈیا کا دور'' ہے۔ اب حالات یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ اگر پریس کانفرنس ہو تو دیر پر آنے والے صحافی کو میز پر ''لوگو والا مائک'' رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ کچھ صحافی تو پانچ مختلف چینلز کے مائک اپنے بیگ میں اس طرح رکھ کر گھومتے ہیں جیسے قدیم دور میں پنساری دوران سفر مختلف جڑی بوٹیاں ساتھ رکھتے کیونکہ گاہک اور مریض کا پتہ نہیں کب مل جائے۔

برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی تعداد کے لحاظ سے پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی کی شرح بہت کم ہے، بدقسمتی سے یہاں رہنے کے باوجود ہمارے لوگ پاکستانی سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہیں۔ جہاں رہتے ہیں وہاں کی سیاست سے اکثریت لاتعلق ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہاں مقیم برٹش پاکستانیوں میں تقریباً 64 فیصد نوجوانوں کی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، چند برسوں تک بزرگوں کی تعداد 15 فیصد تک رہ جائے گی۔ مگر اس کے باوجود ہمارے میڈیا والوں کا ایجنڈا یہاں کی ینگ جنریشن کے لیے باعث تسکین نہیں۔ پاکستان میں صحافی حضرات کو میڈیا مالکان سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ ان کو وقت پر تنخواہ نہیں دیتے، یہ ظلم بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جن کی تنخواہ صرف چند ہزار روپے ہوتی ہے جو لاکھوں روپے بلکہ اب بات کروڑوں تک پہنچ چکی ہے ان کو ایڈوانس میں معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اپنی حق حلال کی تنخواہ کے لیے غریب صحافی خودکشی کرتا بھی نظر آیا مگر دوسروں کے لیے آواز اٹھانے والے صحافی اپنے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کے لیے کبھی ایک پلیٹ فارم پر نظر نہیں آئے۔ برطانیہ میں شاید ایک درجن دیسی صحافی ایسے ہیں جن کو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، باقی تمام اپنا شوق پورا کر رہے ہیں۔ مہذب معاشروں میں کام کرنے کا اصول وہی ہے جو اسلام نے وضع کیا تھا۔ یعنی ٹرم اینڈ کنڈیشنز لکھ کر باہمی معاہدہ کیا جائے اس کے بعد اس پر کاربند رہا جائے۔ یہاں اگر کوئی ورکر تین ماہ کسی کمپنی میں ملازمت کر لے اور اس ادارے کی طرف سے کوئی تحریری معاہدہ نہ ملے تو تین ماہ بعد اس کے حقوق وہی ہو جائیں گے جو لیبر لاء کے مطابق کسی ملازم کے ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں کام کرنیوالے 95 فیصد صحافیوں کو اداروں کی طرف سے نہ کوئی معاوضہ دیا جاتا ہے اور نہ کوئی اور سہولت۔ سکائی نیوز کی براڈکاسٹر مادام 'Kay Burley' نے تو صحافتی میدان میں پاؤں رکھنے کے لیے چند ہفتے فری خبریں پڑھیں تھیں مگر ہمارے دیسی صحافی عرصہ دراز سے Volunteer کام کر رہے ہیں۔ جہاں شکار خود اپنے آپ کو حلال ہونے کے لیے پیش کرے وہاں شکاری کو الزام کیا دینا؟ مگر معیاری کام کی اپنی پرائس ہوتی ہے اگر صحافت مفت میں نیلام ہوتی رہی تو ہماری میڈیا انڈسری کا حال بھی پاکستان ریلوے، سٹیل ملز، او جی ڈی سی، اور پی آئی اے جیسا ہی ہو جائے گا۔ جب میڈیا کی موجودگی میں ملکی ادارے اونے پونے داموں بیچے جا رہے ہیں اور اطلاعات درست طریقے سے عوام تک نہیں پہنچ رہیں تو پھر میڈیا بھی تو ریاست کا چوتھا ستون سمجھا جاتا ہے اور

جب ریاست دیوالیہ ہو جائے گی تو ریاست کے جغرافیہ میں بسنے والے سب اداروں کا حال سٹیل مل جیسا ہو جائے گا اور پھر کچھ بعید نہیں کہ بہت بڑے بڑے میڈیائی نام یا تو دیار غیر میں مزدوری کر رہے ہوں یا پھر جناب علیؓ کے قول کے مطابق دولت اور صحت پر کبھی گمنڈ نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے جانے کا پتہ بھی نہیں چلتا اور ایک امیر اور طاقتور آدمی کسی خیراتی ادارے میں لاوارث پڑا ہوتا ہے۔سو اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم سب محفوظ رہیں تو آج سب سے زیادہ ذمہ داری میڈیا کی بنتی ہے کہ وہ اپنا دیانتدارانہ کردار ادا کرے۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

15-11-2015